تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

Analysis of Paan Chewing in Shaukat Thanvi's Baar-e-Khatir

بارِ خاطر (شوکت تھانوی) میں پان خوری کا تذکرہ

Ujala Emen*
Visiting Lecturer, Department of Urdu, Riphah International University, Faisalabad
Dr. Fatima Jalal
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Education, Faisalabad Campus
Correspondence*: Ujalasandhu9@gmail.com

Copyright: © 2023 by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract

Shaukat Thanvi has mentioned paan chewing and its related matters prominently in almost all the works of "Baar-e-Khatir". The main reason for this is the author's immense passion for paan chewing. He stayed in Lucknow for a long time and was addicted to paan chewing in Lucknow. They also have comparisons to paan and many other accessories. He has also discussed the spices inside the paan and all their types. He believes that paan chewing is integral to the Lucknowi culture. Paan is pure Indian delicacy. He has also compared Paan and poetry. He believes that while applying paan when katha and lime are used on the water, the provision is the same as the poet keeps in mind in the arrangement and decoration of both the verses that the tip of the eyelid should be correct, and no member should grow or decrease. They believe in sophistication even in paan-khori.

Keywords:
Analysis, Pan Chewing, Shaukat Thanvi, Baar-e-Khatir, Laucknow, Poetry and Paan

شوکت تھانوی نے "بارِ خاطر" کے کم و بیش تمام مکاتیب میں پان خوری اور اس کے متعلقات کا ذکر نمایاں طور سے کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ مصنف کی پان خوری سے بے پناہ رغبت ہے۔ وہ ایک لمبے عرصے تک لکھنؤ میں رہے اور لکھنؤ میں پان خوری کے عادی رہے۔ ان کے ہاں پان اور دیگر کئی لوازمات کے موازنے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پان کے اندر ہونے والے مصالحے اور ان کی تمام اقسام پر بھی انھوں نے خوب بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پان خوری لکھنوی تہذیب کے جزو لازم ہے۔ پان خالص ہندوستانی سوغات ہے۔ پان

تحریر
مجلہ زبان و ادب
جلد ۱، شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

خوری کی اس عادت سے متعلق سید امتیاز علی تاج کے نام لکھے گئے مکتوب میں وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

> "حسبِ معمول پان دان سامنے کھلا ہوا ہے۔ ایک گلوری کھا چکا ہوں۔ دوسری کے لیے نیت میں فتور پاتا ہوں اور یہی وقت ہے، آپ کے یاد آنے کا کہ آپ ہوتے تو اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے بھی پان بناتا اور پیش کرتا۔"(۱)

پان خوری کی عادت شوکت تھانوی کی شخصیت کا نمایاں جزو ہے۔ ان کے مکاتیب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے ہمیشہ خود پان بنایا کرتے تھے اور کسی دوسرے کے ہاتھ کا بنا ہوا پان وہ قطعی طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ تاہم چند مکاتیب میں یہ امر مجبوری وہ پان کی عمدہ دکان سے بھی پان کھانے کا ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ امتیاز علی تاج سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

> "چناں چہ بھائی جان! کرتا یہ ہوں کہ مہمانوں کے لیے بازار سے پان منگاتا ہوں اور خود دستِ خود دہانِ خود کا قائل ہوں۔۔۔ جو لذت خود اپنے بنائے ہوئے پان سے حاصل ہوتی ہے وہ کہیں اور نہ مل سکی۔ میں پان میں دستخط، بس ان دو ہی چیزوں میں "بقلمِ خود" کا قائل ہوں۔"(۲)

انھوں نے پان اور شاعری کا بھی موازنہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پان لگاتے وقت جب پانی پر کتھا اور چونا لگایا جاتا ہے تو التزام امر وہی ہوتا ہے جو شاعر دونوں مصرعوں کی ترتیب اور سجاوٹ میں پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ نوک پلک درست رہے اور کوئی رکن بڑھنے یا کم ہونے نہ پائے، ایطانہ خفی ہو نہ جلی، وزن سے گرنے نہ پائے، دونوں مصرعوں میں ربط ایسا ہو کہ شتر گربہ پیدا نہ ہو۔ درحقیقت وہ پان خوری میں بھی نفاست پسندی کے قائل ہیں:

> "صاحب استغفر اللہ! سخت کوفت ہوئی پان دان کھول کر۔ کتھے کی کلیھا الٹ گئی ہے اور سارا پان دان موسلا دھار بارش کے بعد لاہور کے اندرونی موچی گیٹ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ اب میں پان نہیں کھا سکتا۔ پان کے سلسلہ میں میری نفاست پسندی اس کثافت کی تاب نہیں لا سکتی۔ میں پان دانوں اور اگال دان کے فرق کو سمجھتا ہوں اور اس مساوات کا قائل نہیں کہ یہ امتیاز اٹھ جائے۔"(۳)

انھوں نے پان میں استعمال ہونے والے لوازمات کا ذکر بھی اپنے کئی مکاتیب میں کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ پان کے اندر برتے جانے والے لوازمات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "کیوڑے میں بسا ہوا دودھیا کتھا بھی، چھالیا بھی وہ جس کو اہلِ ذوق جاجرہ کہتے ہیں۔ چونا اس قدر

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

شفاف کہ دودھ بھی اس کو اپنا آئینہ سمجھے اور کہسار مری کی برف بھی اس کے سامنے پانی پانی ہو جائے۔ سفید سڈول الائچیاں بھی ہیں اور مشکی دانے کا تمباکو بھی پھر قوام کی شیشیاں تو آپ جانتے ہی ہیں میری جان کے ساتھ ہیں۔"(۴)

اس حوالے سے انھوں نے کئی ایسے اشعار بھی مختلف مکاتیب میں شامل کیے ہیں جن میں مختلف حوالوں سے پان اور پان کے لوازمات کا ذکر موجود ہے۔ اس حوالے سے مجید امجد کی نظم "پنواڑی" بھی لائقِ مطالعہ ہے جس میں اگرچہ زندگی کے تسلسل اور زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ حیات و موت کا فلسفہ پیش کیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ پان اور پان سے جڑے لوازمات کو بھی شاندار انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مذکورہ نظم سے پہلے دو بند ملاحظہ ہوں:

بوڑھا پنواڑی، اس کے بالوں میں ہے مانگ نیاری
آنکھوں میں جیون کی بجھتی آگنی کے چنگاری،
نام کی اک ہٹی کے اندر بوسیدہ الماری
آگے پیتل کے تختے پر اس کی دنیا ساری
پان، کتھا، سگرٹ، تمباکو، چونا، لونگ، سپاری

عمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گزری
چونا گھولتے، چھالیا کاٹتے، کتھ پگھلاتے گزری
سگریٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گزری
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گزری
چند کسیلے پتوں کی گتھی سلجھاتے گزری(۵)

انھوں نے پان کھانے کے آداب پر بھی اپنے مکاتیب میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ان پان خور افراد کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو پان کھانے کے آداب سے واقف نہیں ہیں۔ ایسے افراد پان کھا کر جگہ جگہ تھوکتے دکھائی دیتے ہیں اور ماحولیاتی آلودگی کا سبب بنتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے اکثر شہروں کے بازاروں میں پان کی پچکاریاں جگہ جگہ سڑکوں کی خوبصورتی کو ماند کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے پان خور دوسرے مذہب پان خوروں کی بھی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ ان سے متعلق شوکت تھانوی یوں رقم طراز ہیں:

"یہ پان کھا لینے کے بعد وہ کائنات کو ایک عظیم الشان اگال دان سمجھتے ہیں جس میں ہر طرف خون تھوکتے پھرتے ہیں۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں پر، پھولوں کے گملوں پر، شفاف فرش پر، درودیوار پر غرض ہر طرف پیک کی پچکاریاں نظر آتی ہیں اور حد یہ ہے کہ خود بدولت کی سفید پوشی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ان مناظر کو دیکھنے والے سارا الزام غریب پان کے سر تھوپ دیتے ہیں اور بدنام ہوتے ہیں پان کھانے والے۔"(۶)

شوکت تھانوی نے پان کی مختلف اقسام پر بھی بحث کی ہے۔ ان کا پسندیدہ پان پستئی پان ہے جو وہ لکھنؤ میں کھایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مراد آبادی پان، تمباکو والا پان، میٹھا پان، لاہور پان، بنارسی پان، حیدرآبادی پان وغیرہ جیسی تراکیب بھی مذکورہ مجموعے کے کئی مکاتیب میں ملتی ہیں۔ ان کو تمام پانوں میں لکھنو کا پستئی پان زیادہ پسند تھا۔ اس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

"اس وقت آپ بے طرح یاد آرہے ہیں۔ لکھنؤ سے ایک عزیز بھاگ کر آئے ہیں مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ پستئی پانوں کی ڈھونیاں بھی لائے ہیں اور وہ چکنی ڈلی بھی جو کبھی صاحب کی کفِ دست پر ہوا کرتی تھی۔"(۷)

ان کے خیال میں پستئی پان پورے ہندوستان کا سب سے زیادہ نفیس، خوش ذائقہ اور عمدہ پان ہے۔ پستئی پان معطر، لطیف اور نازک و خنک گلوری میں ہوتا ہے۔ پستئی پانوں کے علاوہ ان مکاتیب میں بنارس کے پانوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ پان خوری میں بنارس ہندوستان کا سب سے مشہور شہر ہے۔ بنارس کو پانوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر دریائے گنگا کے بائیں کنارے پر آباد ہے اور اس کا پرانا نام وارانسی ہے جو بعد میں بگڑ کر بنارسی بن گیا۔ اس شہر میں ہندی تہذیب واضح طور سے سامنے آتی ہے۔ یہ بھارت کی سب سے بڑی ریاست اترپردیش کا شہر ہے اور اس کا دوسرا نام کاشی بھی ہے۔ یہ شہر ہندوؤں کے نزدیک مقدس شہر کا درجہ رکھتا ہے۔ بنارس کے پانوں سے متعلق شوکت تھانوی اپنے خیالات یوں آشکار کرتے ہیں:

"تقسیم ملک سے پہلے پستئی نہ سہی مگر بنارس کے سفید پان لاہور میں مل جاتے تھے۔ وہ ذرا تیز ضرور ہوتے تھے مگر پستی پر تیزی چنداں ناگوار نہ ہوتی تھی اور چونے کی تیزی ان کی تیزی کو رام کر لیتی تھی۔ تاج صاحب آپ نے بنارس کا ذکر کیا تھا تو بے ساختہ رام کرنے کا محاورہ قلم سے نکل گیا۔"(۸)

پانوں کی مختلف اقسام بیان کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے پان خوری کے فوائد بھی مذکورہ مکاتیب میں بیان کیے ہیں۔ ان کے

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

خیال میں پان خوری سے انسانی منہ سے بدبو ختم ہو جاتی ہے اور انسان کے منہ سے خوشبو آنے لگتی ہے۔ انسانی ہونٹ سرخ ہو کر شخصیت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ پان خور انسان بات کرنے سے قبل کئی بار سوچتا ہے اور فضول باتوں سے پرہیز کرتا ہے۔ اس سے متعلق وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

> "پان انسان کو نہایت کم سخن بھی بنا دیتا ہے یعنی انسان ایک ایک بات کو پہلے سو سو مرتبہ منہ میں تولتا ہے پھر اگال دان سے مشورہ کرتا ہے۔ اس کے بعد کہیں بات کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور یاوہ گوئی کے گل کتر رہی ہے۔"(۹)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ پان خوری انسان کو شاعری اور شعر گوئی کی طرف مائل کرتی ہے۔ پان خور شاعر زیادہ اچھی غزل تخلیق کر سکتا ہے اور اس سے دل و دماغ اور روح بھی معطر ہو جاتی ہے۔ پان خوری سے انسان واقعی اشرف المخلوقات بن جاتا ہے اور شاعر کے خیالات معروف فارسی شعرا حافظ شیرازی اور خیام سے ملنے لگتے ہیں۔ انھوں نے پان کو قدرت کا عظیم تحفہ قرار دیا ہے جس سے انکار کسی صورت نہیں کیا جا سکتا۔ حفیظ ہوشیار پوری سے مخاطب ہو کر وہ پان خوری کے مثبت اثرات یوں بیان کرتے ہیں:

> "ایک مرتبہ صرف پان کھا کر دیکھیے کہ آپ کے لبوں پر کیسی غزل برستی ہے۔۔۔ آپ کے انسان ہونے میں شک نہیں اور بے شک آپ شاعر بھی ہیں مگر پان کھا کر آپ اشرف المخلوقات بن سکتے ہیں اور شاعر نظر بھی آ سکتے ہیں۔"(۱۰)

حفیظ ہوشیار پوری سے مخاطب ہو کر پان خوری کے جسمانی اور تخیلاتی فوائد پر وہ یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> "خدا بھلا کرے اقبال صفی پسری کا قوام خانہ شاز کی ایک چھوٹی سی شیشی دے گئے ہیں جس نے اس وقت روح کو ایسا مہکایا ہے کہ گویا حافظ اور خیام سے معانقہ کر رہا ہوں۔ منہ میں پان ہے، لبوں پر اس کی سرخی ہے۔ روح میں تعطر ہے اور ایک ہلکا سا سرور۔"(۱۱)

انھوں نے پان کو ایک عظیم نعمت قرار دیا ہے اور ان لوگوں پر اظہارِ افسوس کیا ہے جو پان جیسی نعمت سے محروم ہیں۔ پان نہ کھانے والا شخص زندگی کی حقیقت لطف سے ناآشنا ہے اور اسے زندگی سے متعلق اصل رموز کبھی ظاہر نہیں ہو سکتے۔ پان خوری سے پرہیز زندگی کو بے کیف اور بے مروت بنا دیتا ہے۔ اس حوالے سے پان نہ کھانے کے نقصانات سے انھوں نے قاری کو آگاہ کیا ہے:

> "آپ کو اس زندگی کی بے کیفی اور بے ثباتی کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے جو بغیر پان کے بسر ہو رہی ہے۔۔۔ صرف ایک پان کی کمی زندگی میں کتنا بڑا خلا پیدا کر دیتی ہے۔۔۔ مگر یہاں تو

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

زندگی کا ایک ہی سہارا ہے۔ پان اور صرف پان۔ وہ پان جو رفتہ رفتہ قصہ پارینہ بنتا جا رہا ہے اور زندگی کا اسلوب بے رنگ ہو رہا ہے۔"(۱۲)

انھوں نے پان خوری کے ساتھ ساتھ سگریٹ نوشی اور بے نوشی کے حوالے سے بھی جامع انداز میں گفتگو کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پان خالص ہندوستانی سوغات ہے جب کہ سگریٹ مغربی تہذیب کی وجہ سے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ انھوں نے پان خوری اور سگریٹ نوشی کا موازنہ بھی کیا ہے اور سگریٹ کی اقسام اور اس کے منفی اثرات پر بھی بحث کی ہے۔ سگریٹ کی اقسام سے متعلق وہ عشر ترجمانی سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

"آپ کا کیا ہے پان اصل نہ ملے بنا سپتی کھا لیے ؟ سگریٹ پی لی۔ سگریٹ گولڈ فلیک نہ سہی تھری کیسل سہی، تھری کیسل نہ سہی قینچیہ، بگلہ، پلیرز، مرچ، تار کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گی۔ آپ کے ایسے ہر جائی کے لیے کیا کمی ہے۔"(۱۳)

ان کے علاوہ بھی انھوں نے سگریٹ کی مختلف اقسام اپنے مکاتیب میں بیان کی ہیں۔ ان میں ایرانی سگریٹ اور برطانوی سگریٹ کی مثالیں مختلف مکاتیب میں مل جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے سگریٹ نوشی کے مضر اثرات کو بھی قاری کے سامنے رکھا ہے۔ ان کے مطابق سگریٹ نوشی انسانی عمل تنفس کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے اور پھیپھڑوں کے سرطان کا باعث بھی بنتی ہے۔

"یہ حق آپ کا ہے مختلف اقسام کے سگریٹوں کا البم آپ کا پھیپھڑا ہے۔ آپ ڈھونڈتے پھرتے ہیں نت نئے سگریٹ اور جب کوئی نئی قسم دریافت کر لیتے ہیں اس وقت آپ کے تیور واسکوڈے گاما سے کم نہیں ہوتے۔ اس سگریٹ نوشی نے آپ کو جو نقصان پہنچایا ہے اس سے آپ بے خبر نہیں۔"(۱۴)

انھوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انگریزی حکام ہندوستان میں پان خوری کے بجائے سگریٹ نوشی کیا کرتے تھے۔ سگریٹ خالص برطانوی تہذیب کی عطا ہے۔ جب کہ پان خوری ہندوستانی تہذیب کا حصہ ہے۔ پان خوری کے علاوہ انھوں نے نسوار، بیڑی، گٹکا وغیرہ جیسی تراکیب بھی مختلف مکاتیب میں برتی ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے حضرت تسکین قریشی کے نام لکھے گئے مکتوب میں پان خوری کے ساتھ ساتھ گٹکے کا موازنہ کچھ یوں کیا ہے:

"بات یہ ہے کہ دیسی پان کی موجودگی میں گٹکا کھانا میرے نزدیک کفرانِ نعمت ہے۔ مگر دیسی پان کی بجائے یہ پٹ سن کے پتے کھا لینا میرے مشرب میں صریح شرک ہے۔ لوگ میرے جنوں

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

پر ہنستے ہیں کہ میں اس ذرا سے سبز پتے کو اتنی اہمیت دیتا ہوں۔ اب میں ان کو اس ذرا سے سبز پتے کی اہمیت کس طرح سمجھاؤں۔"(۱۵)

پان خوری کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں شراب نوشی کا ذکر بھی نمایاں طور سے کیا گیا ہے۔ وہ شراب نوشی کے اگرچہ رسیا نہیں تھے مگر ان کے کئی رفقا مے نوشی کے عادی رہے ہیں۔ مے نوشی کے لیے انھوں نے انگور کی بیٹی کی ترکیب کئی مکاتیب میں برتی ہے۔ اس حوالے سے پنڈت ہری چند اختر کے نام لکھا گیا مکتوب لائقِ مطالعہ ہے جس میں انھوں نے انگور کی بیٹی کا ذکر بڑے تواتر کے ساتھ کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"آپ پان سے بھی اس طرح ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ بھی انگور کی بیٹی کی طرح انگوری کا باپ ثابت نہ ہو جائے۔"(۱۶)

اگر شوکت تھانوی کے مکاتیب کے مجموعے بعنوان "بارِ خاطر" میں پان خوری اور اس کے متعلقات کا جائزہ مجموعی طور سے لیا جائے تو انھوں نے بیشتر مکاتیب میں پان سے متعلق بحث کی ہے۔ وہ پان کی منشیات کی فہرست میں داخل کرنے کی بجائے اسے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا جزو لازم تصور کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغلیہ عہدِ سلطنت اور نو آبادیاتی دور میں ہندوستان کے بڑے شہروں میں پان خوری باقاعدہ ایک رواج کا درجہ رکھتی تھی۔ بڑے بڑے امرا و رؤسا کے گھروں اور مختلف تقاریب میں پان کھانے اور کھلانے کا رواج تھا۔ اسی رواج کے تحت مصنف بھی پان خوری کے رسیا تھے۔ انھوں نے بیشتر مکاتیب میں پان خوری کے فوائد بھی گنوائے ہیں جن کا ذکر مختلف اقتباسات کی صورت میں بالا سطور میں درج کیا گیا ہے۔ پان خوری کے علاوہ انھوں نے چھالیا، بیڑی، نسوار، گٹکا، مے نوشی اور سگریٹ نوشی کا ذکر بھی تواتر سے کیا ہے۔

پان خوری میں مصنف باقاعدہ اہتمام، نفاست اور سلیقے کے قائل ہیں۔ جو لوگ پان خوری، میں بد سلیقگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، مصنف نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور ان پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ انھوں نے سگریٹ نوشی کو انگریزوں کی ایجاد اور مغربی بدعت قرار دیا ہے۔ جس کے بے پناہ منفی اثرات انسانی قلب و اذہان اور جسم پر مرتب ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے پانوں کی مختلف اقسام بھی گنوائی ہیں۔ جن میں لاہوری پان، پستئی پان، مرادآبادی پان، حیدرآبادی پان، میٹھا پان، تمباکو والا پان، بنارسی پان وغیرہ نمایاں ہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ مصنف کو سب سے زیادہ پستئی پسند ہیں۔ مزید بر آں انھوں نے اس حقیقت کا بھی برملا اعتراف کیا ہے کہ وہ صرف اپنے ہاتھ سے بنا پان کھانا پسند کرتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پان خوری ایک وسیع موضوع کے طور پر ان کے مکاتیب میں سامنے آتا ہے۔

شوکت تھانوی کے مکاتیب میں ادبی نظریات، مختلف ادیبوں کے تخلیقات اور ادبی محافل کو بھرپور طور سے موضوع بنایا گیا

ہے۔ انھوں نے مختلف کتب پر دل چسپ انداز سے ادبی تبصرے بھی کیے ہیں۔ نواب مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی کے نام لکھے گئے مکتوب میں انھوں نے مولانا عبدالحلیم شرر کی کتاب ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' پر بحث کی ہے۔ اس کتاب کو ''گزشتہ لکھنو'' کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں لکھنوی تہذیب و تمدن کو تاریخی ناول نگار عبدالحلیم شرر نے کمال مہارت سے بیان کیا ہے۔ اس میں لکھنو کے بادشاہوں اور دیگر تاریخی مقامات اور احوال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے متعلق مختصر انداز میں شوکت تھانوی یوں تبصرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں:

> ''مولانا عبدالحلیم شرر کی ایک کتاب کا نام ہے۔ ''مشرقی عمدن کا آخری نمونہ'' یہ کتاب میرے پاس ہے اور جب کبھی نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ ذہن فوراً منتقل ہو جاتا ہے آپ کی طرف۔ اس لیے کہ میرے ذہن نے یہی نام آپ کا رکھ چھوڑا ہے۔''(۱۷)

شوکت تھانوی نے معروف مزاحیہ شاعر ظریف جبل پوری کی نظم ''لالو کھیت'' پر بھی اپنا تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے اس نظم کے فکری محاسن پر بھی اپنا تبصرہ کیا ہے۔ مصنف نے مذکورہ نظم کو کامیاب مرثیہ یا ٹریجڈی قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے ہاں سامعین کسی کی داستانِ غم کو سن کر ہنستے ہیں۔ ان کے مطابق کامیاب مزاح نگار کے اندر بلا کا کرب پوشیدہ ہوتا ہے۔ مزاح نگار عموماً اپنے مصائب اور اپنی مشکلات کی داستانیں مزاحیہ انداز میں سامعین کو سناتے ہیں اور سامعین ان کے غم سے تفصیلات سن کر اپنے غم غلط کرتے ہیں۔ مذکورہ نظم سے متعلق شوکت تھانوی یوں رقم طراز ہیں:

> ''آپ کا وہ مرثیہ جس کا نام ''لالو کھیت'' ہے جب آپ سناتے ہیں کہ خانہ بدوشی کی اس خونچکاں داستان پر یہ قہقہے بلند کرنے والے آخر کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں؟۔۔۔ یہ بڑی عبرت انگیز نظم ہے اور اس میں ہنسنے سے زیادہ رونے کے مقامات ہیں۔ اب آپ اس کو میری ناسمجھی سمجھیں یا دیوانگی کہ مجھ کو آپ کے ان اشعار میں بڑی ٹریجڈی نظر آتی ہے۔''(۱۸)

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے نام لکھے گئے خط میں انھوں نے ادبی تحقیق سے متعلق گفتگو کی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے پاس ادب اردو کے مختلف اصناف کے متعلق ایسے ایسے نادر اور نایاب نسخے موجود ہیں جن سے اردو ادب کے تحقیقی میدان کی کئی گم شدہ کڑیاں آپس میں مل سکتی ہیں۔ انھوں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی کی لیاقت اور ادب سے انہماک کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور ان کے علمی و ادبی نوادر پر اظہارِ حیرت بھی کیا ہے۔ معروف ڈرامے ''اندر سبھا'' سے متعلق وہ ان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱، شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

''کل ہی کی بات ہے اردو ادب میں فن تمثیل کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ اودھ کے واجد علی شاہی دور میں اندر سبھا کا اسٹیج ہونا طے ہے۔ مگر وہ کس طرح اسٹیج ہوا، میک اپ کے کیا انتظامات تھے، روشنی کا کیا اہتمام تھا، پردے کے باہر کیا تھا، پردے کے پیچھے کیا تھا، ہدایت کاری کی نوعیت کیا تھی؟ کہنے والے کہتے ہیں ان تمام تفصیلات کا آپ سے علم ہو سکتا ہے اس لیے کہ آپ کے پاس اندر سبھا کی وہ پروڈیوسر کاپی تک موجود ہے جس پر خود واجد علی شاہ کے قلم سے ہدایات رقم ہیں۔''(۱۹)

مولانا عبدالمجید سالک کے نام لکھے گئے مکاتیب میں انھوں نے مختلف مزاحیہ تخلیقات اور اخباری کالموں کے حوالے سے بھرپور بحث کی ہے۔ اس مکتوب میں انھوں نے لکھنؤ کے روزنامہ ہمدم کا ذکر کیا ہے۔ ہمدم کے معاصرین میں روزنامہ انقلاب کی تحسین میں بھی چند کلمات ادا کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''حوادث وافکار'' اور ''دو دو باتیں'' کے عنوان سے تحریر کردہ کالمی سلسلوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ افکار و حوادث کے عنوان سے مولانا عبدالمجید سالک کالم لکھا کرتے تھے اور ''دو دو باتیں'' کے عنوان سے شوکت تھانوی مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ اس حوالے سے مذکورہ خط سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اب سے چھبیس، ستائیس برس پہلے جب میں لکھنؤ کے روزنامہ ہمدم کا مدیر معاون اور پھر مدیر تھا، ہمدم کے معاصرین میں سے صرف انقلاب ہی ایک ایسا روزنامہ تھا جس کو میں نے اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھا اور اگر سچ پوچھیے تو اس کا ہر لا ''حوادث و افکار'' ہی تھا جس نے مجھ سے مزاح لکھوایا۔ ہمدم کا مزاحیہ کالم ''دو دو باتیں'' میری مزاح نگاری کا گھٹنیوں چلنے والا بچپن تھا۔''(۲۰)

انھوں نے پروفیسر وقار عظیم کے نام لکھے گئے مکتوب میں اردو ادب میں تحقیق و تنقید کی روایت پر مختصراً بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں پروفیسر وقار عظیم ادب کا صحیح ذوق اور شعر کا صحیح وجدان رکھنے والا، شعر و ادب کی ہر رنگینی میں ڈوبنے کی پوری صلاحیت رکھنے والا نہایت ٹھوس اور ٹھس قسم کا نقاد اور ادب کا مورخ بن کر رہ گیا ہے۔ ان کے خیال میں نقاد کسی بھی تخلیق کار کی خوبیوں کو دیکھنے کی بجائے عمومی طور پر خامیوں کو دیکھتا ہے۔ مگر سید وقار عظیم خامیوں کے بجائے تخلیق کار کے مثبت پہلوؤں کو زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔ بقول شوکت تھانوی:

''تنقید نگار اتنا حسن شناس نہیں ہوتا جتنا عیب جو ہوتا ہے۔ مگر حیرت آپ پر ہے اس لیے کہ آپ فطرتاً حسن شناس ہیں۔ ہر حسین منظر آپ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دیتا ہے۔''(۲۱)

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

انھوں نے تنقید نگاری کے اصول وضوابط پر اپنی رائے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام لکھے گئے مکتوب میں پیش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید نگاری میں اگرچہ خامیوں اور خوبیوں دونوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔ مگر عمومی طور پر تنقید نگاری میں تخلیق کار کی خامیوں پر بحث زیادہ کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے مذکورہ مکتوب میں وہ اپنے خیالات یوں پیش کرتے ہیں:

> ''تنقید نگار اتنا حسن شناس نہیں ہوتا جتنا عیب جو ہوتا ہے۔ وہ بال کی کھال اس لیے نہیں نکالتا کہ اس میں خود اپنی صناعی کا کوئی جوہر دکھا سکے بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس تجزیہ سے صنعتی لغزشوں کو اجاگر کرے۔''(۲۲)

مولانا نیاز فتح پوری کی زیر ادارت شائع ہونے والے جریدے ''نگار'' سے متعلق انھوں نے چند حقائق مولانا نیاز فتح پوری کے نام تحریر کردہ خط میں لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی سعادت حسن منٹو پر بے جا تنقید کو خوب آڑے ہاتھوں سے لیا ہے اور اس پر طنز کے خوب نشتر چلائے ہیں۔ منٹو کی وفات کے بعد مولانا تاجور نجیب آبادی نے سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور فن پر طنز کے جو نشتر چلائے ہیں اس پر شوکت تھانوی نے اظہارِ افسوس کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں:

> ''مولانا یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا ہر گز نہ بخشے مرنے والے میں سوائے عیوب کے کچھ تھا ہی نہیں۔ منٹو کی زندگی میں یہ اختلاف ہوتا تو ٹھیک تھا اب اس کے مرنے کے بعد یہ زیادتی ہے مولانا کی مگر میں نے اس وقت بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ کاش یہی منٹو آپ کا سب سے قریبی عزیز ہوتا اس وقت لوگ اندازہ کرتے کہ آپ اپنے اس عزیز کو بھی نہ بخشتے اور یہی چاہتے کہ خدا بھی نہ بخشے۔''(۲۳)

انھوں نے مجید لاہور کی مزاح نگاری پر بھی اپنا تبصرہ پیش کیا ہے۔ مجید لاہور مزاحیہ رسالہ ''نمکدان'' کے مدیر رہے اور انھوں نے اردو مزاح نگاری کے میدان میں بے شمار پھلجھڑیاں برسائیں۔ مجید لاہور کے نام لکھے گئے مکتوب میں انھوں نے مجید لاہور کو اردو مزاح کا رستم زماں قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مجید لاہور کی مزاح نگاری پر اسماعیل میرٹھی کی رائے اور ان ک ساتھ اپنا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ بقول شوکت تھانوی:

> ''مختصر یہ کہ یہ جھوٹ جو ہم مزاح کے نام سے بولتے ہیں ان حالات میں جو ہم پر گزر رہے ہیں آخر کہاں تک سرسبز رہے گا؟ کیا بقول مولانا اسماعیل میرٹھی یہ کاغذ کی ناؤ ہمیشہ چلتی رہے گی۔ ہنسنے ہنسانے کی اس اداکاری کی رسی آخر کہاں تک دراز ہو گی۔ آپ تو خیر ماشاءاللہ ورزشی قسم کے

مزاح نگار ہیں مگر مجھ کو اپنی جان ناتواں کی طرف سے شدید اندیشہ ہے اور اسباب میں بارہا اپنا اور آپ کا تقابل کر چکا ہوں۔"(۲۴)

انھوں نے بھارت میں غالب شناسی کے حوالے سے ہونے والی تحقیقی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں بصری ادب کی مختلف شاخوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ بھارت میں مالک رام جیسے نامور غالب شناسوں نے غالب کے فکر و فن کی ترویج میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور غالب کے افکار کو آسان فہم بنایا۔ علاوہ ازیں غالب کی شخصیت اور زندگی پر فلمی صنعت نے بھی اپنا حصہ ڈالا اور غالب کے فن کو فلموں میں دکھانے کی کوششیں کیں۔ مولوی عبدالحق کے نام لکھے گئے مکتوب میں انھوں نے حقائق یوں بیان کیے ہیں:

"ابھی پچھلے دنوں جس ہندی تصویر کو پہلا انعام دیا گیا ہے اس کا نام ہے "مرزا غالب" ظاہر ہے کہ مشہور فلم ساز سہراب مودی نے اردو کے عظیم المرتبت شاعر کو اپنے جس فلم کا موضوع بنایا ہے وہ فلم اردو ہی کا ہو سکتا ہے۔ مگر اعلان یہی کیا گیا کہ اس سال کا بہترین ہندی فلم "غالب" قرار پایا ہے۔"(۲۵)

سید محمد جعفری کے نام لکھے گئے مکتوب میں انھوں نے سید محمد جعفری کی نظموں سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ سید محمد جعفری کا شمار اردو کے نامور مزاح نگار شعرا میں کیا جاتا ہے۔ مذکورہ خط میں سید محمد جعفری کے مختلف اشعار اور ان کی تحریفات بھی کمال مہارت اور ادبی خدمت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سید محمد جعفری کی نظموں میں محنت کش افراد کے استحصال پر خوب طنز کیا گیا ہے۔ اس طرز کی نظموں میں سید محمد جعفری نے صاحبِ اقتدار اور ثروت مند افراد کو آڑے ہاتھوں لیا ہے جس کا ذکر تفصیلی انداز میں مصنف نے مذکورہ مکتوب میں کیا ہے۔ اس تناظر میں وہ لکھتے ہیں:

"آپ بھی کہیں گے کہ میں نے یہ کیا ذکر آپ سے چھیڑ رکھا ہے اور اس موضوع پر آپ سے کیوں بات کر رہا ہوں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کی وہی نظم جو آج ذہن میں ابھری ہے۔ اس ذکر کا صحیح مخاطب صرف آپ ہی کو ثابت کرتی ہے۔"(۲۶)

سید امتیاز علی تاج کے نام تحریر کردہ مکتوب میں مثنوی زہر عشق اور اس کے کرداروں سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس مکتوب میں جس کردار کو سب سے زیادہ موضوع بحث بنایا گیا ہے، وہ سوداگر صاحب کی صاحب زادی محترمہ مہ جبین کا کردار ہے۔ اس کردار کا ذکر وہ بالواسطہ یوں کرتے ہیں:

"تاج صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مثنوی زہر عشق کا میں ہیرو ہوتا اور سوداگر

تحریر
مجلہ زبان و ادب
جلد ۱ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

صاحب کی صاحب زادی مجھ سے مہ جبین پان کھلانے پر اصرار کرتیں تو میں انکار کر دیتا۔"(۲۷)

اسی مکتوب میں انھوں نے مختلف شعری اصطلاحات کا ذکر بھی نمایاں طور سے کیا ہے۔ ان شعری اصطلاحات میں شتر گربہ نمایاں ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے امتیاز علی تاج کی فکشن نگاری پر بھی اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ انھوں نے فلمی صنعت کے اہم کرداروں اور فلمی صنعت میں استعمال ہونے والی شاعری کو بھی مذکورہ خط میں موضوع بنایا ہے۔ بقول شوکت تھانوی:

"کہانیاں آپ لکھیں، مکالمے آپ لکھیں اور ڈائریکشن آپ دیں۔ مگر تاج صاحب آپ کبھی سجدۂ شکر بھی ادا کرتے ہیں کہ آپ کو خدا نے فلمی شاعر بننے سے بال بال بچا لیا۔"(۲۸)

حفیظ جالندھری کے نام لکھے گئے مکتوب میں انھوں نے حفیظ جالندھری کی شخصیت اور کلام سے متعلق چند حقائق قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے حفیظ جالندھری کی لاجواب تخلیق شاہنامہ اسلام اور پاکستان کے قومی ترانے کی تخلیق کی وجہ سے انھیں بیسویں صدی کا اہم ترین شاعر گردانا ہے۔ انھوں نے مزاحیہ انداز میں ان کو کوئی بار ابوالاثر فردوسی اسلام خان بہار حفیظ جالندھری کے لقب سے یاد کیا ہے۔ علاوہ ازیں مصنف کے خیال میں سقوطِ بنگال سے قبل مشرقی اور مغربی بازو کے مابین اتحاد کے فروغ کے لیے حفیظ جالندھری نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس سے متعلق شوکت تھانوی رقم طراز ہیں:

"اس وقت ملت کو ایسے شاعروں کی ضرورت ہے جو نہ اردو میں شعر کہیں نہ بنگلہ میں بلکہ ایک ایسی زبان میں شعر کہیں جس میں زبان کا سوال ہی پیدا نہ ہو اور آپ کا یہ شعر یقیناً ایک ایسی زبان کا شعر ہے جس کے لیے اردو یا بنگلہ کی لغت کھولنے کی ضرورت نہیں۔"(۲۹)

مصنف کے خیال میں حفیظ جالندھری وقت اور اردو شاعری کی ضرورت ہیں۔ ان کی شخصیات سے متعلق شوکت تھانوی کی مزید رائے کچھ یوں سامنے آتی ہے:

"میرے بھائی! اس قسم کے شعر کہنے کے لیے خدا آپ کو کم سے کم اس وقت تک ضرور زندہ رکھے جب تک اردو زندہ ہے اور اردو یقیناً اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک آپ کے یہ شعر زندہ ہیں۔ ہم کو اس وقت شاعری کی زندگی نہیں چاہیے اردو کی زندگی درکار ہے۔"(۳۰)

حفیظ جالندھری کے ساتھ ساتھ حلقہ ارباب ذوق کے نمائندہ شاعر حفیظ ہوشیارپوری کی غزل گوئی کو انھوں نے حفیظ ہوشیارپوری کے نام لکھے گئے طویل مکتوب میں بیان کیا ہے۔ اس خط میں انھوں نے سب سے پہلے حفیظ ہوشیارپوری کے اس کلام پر اپنا تبصرہ پیش کیا ہے جس میں حفیظ ہوشیارپوری کے تصور محبوب سے متعلق خدوخال ابھرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف وسائل کے حفیظ ہوشیارپوری

تحریر
مجلہ زبان و ادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

نمبر ز سے متعلق بھی بنیادی معلومات مذکورہ مکتوب میں فراہم کی گئی ہیں۔ انھوں نے حفیظ ہوشیارپوری کے ان اشعار کو بھی شامل مکتوب کیا ہے جن میں محبوب کا تصور بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شوکت تھانوی کے خط سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''آپ کے کلام سے آپ کے جو محبوب نمایاں ہوئے ہیں وہ میرے لیے بوجوہ بے کار ہیں مجھے تو اس وقت آپ کی غزل پڑھ کر خود آپ ہی سے غزل کے موضوع پر گفتگو کرنا ہے اور اس گفتگو کا طریقہ میرے امکان میں صرف یہ ہے کہ قلم لے کر بیٹھ جاؤں اور آپ کو مخاطب سمجھ لوں۔''(۳۱)

اس مکتوب میں انھوں نے حفیظ ہوشیارپوری کی غزلیات کا موازنہ مرزا اسد اللہ خاں غالب، اقبال صفی پوری اور امیر مینائی سے کیا ہے۔ ان شعرا کے علاوہ انھوں نے حفیظ ہوشیارپوری کی غزلیات کا موازنہ معروف فارسی شعرا حافظ شیرازی اور خیام سے کیا ہے۔ مزید بر آں مکتوب نگار نے غزل گوئی کی وسعت اور غزل میں موضوعات کی فراوانی کو بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو غزل کو بیسویں صدی میں جن شعرا نے خوبصورت لب و لہجہ عطا کیا، ان میں حفیظ ہوشیارپوری کا نام زیادہ نمایاں ہے۔ اس تناظر میں وہ یوں لکھتے ہیں:

''غنیمت ہے کہ اس دور میں آپ غزل کو آبِ حیات پلا رہے ہیں اور صرف غزل ہی کو زندہ رکھنے میں کوشاں رہتے ہیں بلکہ غزل کو خود اپنی زندگی کا آئینہ دار بھی بنائے ہوئے ہیں۔ آپ غزل کے دور کی طرف واپس نہیں گئے ہیں بلکہ غزل کو اس دور کا شریکِ سفر بنائے ہوئے ہیں اور ظرف تنگنائے غزل ہی میں وہ وسعتیں پیدا کر دی ہیں کہ ہر بیان کی گنجائش اس میں نظر آتی ہے۔''(۳۲)

انھوں نے ترقی پسند ناقدین کی جانب سے غزل گوئی کے خلاف کھولے جانے والے محاذ کو دلائل کے ساتھ مذکورہ بالا شخصیت کے نام لکھے گئے مکتوب میں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ حفیظ ہوشیارپوری حلقہ اربابِ ذوق کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ترقی پسندوں کی جانب سے غزل کو تنقید کا ہدف بنائے جانے کے بعد حفیظ ہوشیارپوری نے مناسب طور سے غزل کا دفاع کیا۔ غزل کو بلاشبہ اردو شاعری کی آبرو قرار دیا جاتا ہے۔ حفیظ ہوشیارپوری نے غزل گوئی کی طرف اس وقت توجہ کی جب نو آبادیاتی نظام کے تحت غزل گوئی کو ترک کر کے نظم گوئی کو پروان چڑھایا گیا۔ بقول شوکت تھانوی:

''یہ شعر غزل کے منکروں کے سامنے پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ترقی پسندی آگر دھاندلی کا دوسرا نام نہیں ہے تو ان منکروں کو غزل پر ایمان لے آنا چاہیے۔ نہ گل ہے نہ بلبل ہے نہ ہجر کا رونا، نہ فراق کا دکھڑا، ایک زندہ حقیقت ہے اور غزل کے ایک شعر میں، شعر بھی خالص غزل کا

ہے اور اندازِ بیان بھی لطف ور خسر کے زمانے کی غزل کا نہیں بلکہ آج کا۔"(۳۳)

شوکت تھانوی کے مکاتیب میں مختلف ادبا اور تخلیق کاروں کی تخلیقات اور قلمی فن پاروں پر کامیابی سے بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مختلف ادیبوں کے مابین ہونے والی ادبی معرکوں سے متعلق بھی کامیابی سے گفتگو کی ہے۔ مزید بر آں ہندوستان اور پاکستان میں ہونے والے مشاعروں اور ادبی تحریکوں سے وابستہ ادبی حقائق کو تفصیلی انداز میں کیا گیا ہے۔

اس دنیا کے سبھی دانش مند اور فلسفی اس نکتے پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ یہ دنیا دکھوں اور مصائب و آلام کا گھر ہے۔ انسان روتا ہوا دنیا میں آتا ہے اور منہ بسورتا ہوا یہاں سے رخصت ہوتا ہے۔ غالب کے خیال میں تو زندگی اور غم تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان ساری باتوں کو تسلیم کر لینے کے باوجود ہی آدمی موت سے بہت پہلے ہی غم سے نجات پانے کے لیے ہر دم اور ہر پل کوشاں ہے۔ چاہے یہ نجات عارضی اور لمحاتی ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ ان غموں اور دکھوں سے نجات کی سب سے خوب صورت اور معتبر ترکیب بھی مختلف مزاح نگاروں نے بیان کی ہے۔

مزاح نگاری ایک ایسے جذبے اور حربے کا طور پر سامنے آتا ہے جو انسان کو وقتی طور پر ہی سہی، رنج والم کی نگری سے دور لے جاتا ہے اور اسے کائنات کے خوش رنگ چوکھٹے میں سجنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ طنز اور مزاح دو الگ الگ کیفیات ہیں۔ مزاح ایسی ہنسی یا کشادگی طبع کا نام ہے جس میں وقار اور متانت کے پہلو کو نظر انداز نہ کیا جائے اور یہ کہ اس کا مقصد ایسی خوش خلقی اور فرحتِ قلوب ہے جو خیر اور تلطف پر مبنی ہو نہ کہ اس کا مقصد اذیت پہنچانا یا کسی کی تحقیر و تذلیل کرنا ہو۔ جب کہ مزاح کے بر عکس طنز ایک ایسا ادبی اسلوب ہے جس میں کسی فرد، بنی نوع انسان یا مکتبہ فکر کی کمزوریوں، برائیوں اور بداخلاقیوں کو اصطلاح کے خیال سے تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنایا جائے۔ طنز و مزاح سے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا اپنے خیالات یوں پیش کرتے ہیں:

> "بعض لوگوں کے نزدیک طنز کو اپنی افادیت کے باعث مزاح پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں مزاح ایک قومی کارنامہ ہے وہاں طنز ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگ مزاح برائے مزاح کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک طنز ہی ادب میں مستقل اقدار کی حامل ہے لیکن درحقیقت یہ نظریہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتی ہے۔ لیکن دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی، پھیکی اور بدمزہ زندگیوں کو منور کرتا اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے۔ فی الواقعے

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

افادیت کے نقطۂ نظر سے دونوں ہمارے رفیق و غم گسار ہیں اور ہم ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے سے قاصر۔"(۳۴)

طنز و مزاح کے مختلف حربے اور کئی متعارف صورتیں ہیں جن میں ظرافت، طنز، مزاح، بذلہ سنجی، ضلع جگت، پھبتی، رعایت لفظی، ہجو، ہزل گوئی، نغز، چشمک، رمز، ایہام گوئی، فقرہ بازی، لطیفہ، ٹھٹھول، ریختی، تحریف نگاری، استہزا، شوخی، تشبیہ، موازنہ تقلید، نوک جھونک، پھکڑ بازی، عریانی وفحاشی، مزاحیہ کردار، لفظی ہیر پھیر، علامت اور مبالغہ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

شوکت تھانوی کی کتاب بعنوان "بارِ خاطر" میں طنز و مزاح کے کئی کامیاب نمونے ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شوکت تھانوی بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ ان کی کئی تخلیقات طنز و مزاح ادب کی آئینہ دار ہیں۔ اس حوالے سے ان کی کتاب "بارِ خاطر" بھی کافی اہم ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے طنز و مزاح کے مختلف حربے برتے ہیں۔ مثال کے طور پر معروف شاعر حفیظ ہوشیار پوری کے نام لکھے گئے مکتوب میں انھوں نے حفیظ ہوشیار پوری کی شکل وصورت اور شاعرانہ مقام و مرتبے پر پھبتی کسنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حفیظ ہوشیار پوری شکل وصورت کے اعتبار سے شاعر دکھائی نہیں دیتے۔ اس تناظر میں ان کا اقتباس لائقِ توجہ ہے:

"سگریٹ پی کر شعر کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ٹائپ کر کے نامۂ محبت کسی کو بھیجے۔ شیو کرتے وقت آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے کا اتفاق تو آپ کو ہوا ہو گا مگر آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ آپ صورت سے اتنے بڑے شاعر نظر نہیں آتے جتنے بڑے دراصل آپ ہیں۔ اگر بمشکل تمام آپ کو صورت دیکھ کر شاعر تسلیم کر بھی لیا جائے تو آپ زیادہ سے زیادہ بلینک ورس کے شاعر نظر آتے ہیں۔"(۳۵)

اس کے علاوہ انھوں نے حفیظ ہوشیار پوری کی تاریخ گوئی پر بھی طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ حفیظ ہوشیار پوری اکثر اپنے رفقا اور مختلف شعرا کی وفات کی تاریخ بذریعہ اشعار نکالا کرتے تھے۔ وہ فن تاریخ گوئی میں بڑے ماہر تھے۔ علاوہ ازیں اسی مکتوب میں دنیا کی آبادی میں ہونے والے بے ہنگم اضافے کو بھی شوکت تھانوی نے آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ دنیا کی آبادی میں جس طریقے سے ہر سال اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے مذکورہ خط سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک طرف تو آپ کو دیکھتا ہوں آپ کے ان اشعار کو دیکھتا ہوں پھر آپ کے اُس ذوق کو دیکھتا ہوں جس نے آپ کو ایک مشاق تاریخ گو بنا رکھا ہے۔ دن رات آپ کو یہی فکر رہتی ہے کہ یہ شخص جو ابھی مل کر گیا ہے اگر آج ہی مر جائے تو اس کی تاریخ یہ ہو سکتی ہے بلکہ آپ کو رنج ہوتا

تحریر
مجلہ زبان و ادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

ہے کہ فلاں صاحب خواہ مخواہ زندہ رہنے پر مصر ہیں جب کہ نہایت لاجواب مادۂ تاریخ بے کار ہوا جارہا ہے۔ آپ سے کوئی بات کرے اور آپ فرمائیں کہ آپ کی اس گفتگو کے فلاں جملے سے اس ملاقات کی تاریخ نکل آئی ہے۔ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کب آپ کوئی برجستہ تاریخ نکال کر مرنے پر مجبور کر دیں۔ یقین جانیے مجھے ایسا کوئی ذوق نہیں کہ آپ تاریخ وفات نکالیں اور میں زندہ رہوں۔ البتہ التماس یہ ہے کہ بچے بہت چھوٹے ہیں اور کچھ ان سے بھی زیادہ چھوٹے بچے دنیا کی آبادی میں اضافہ کرنے کے امیدوار ہیں لہٰذا اگر تاریخ وفات میں ذرا تاخیر سے کام لیں تو اچھا ہے تاریخ گوئی کے اس شوق کو فی الحال تاریخ پیدائش اور تاریخی ناموں سے پورا کریں تو مناسب ہو گا۔"(۳۶)

اسی طرح حفیظ جالندھری کے نام لکھے گئے مکاتیب میں انھوں نے خود کو دریائی جانور قرار دیا ہے۔ حفیظ جالندھری پاکستان کے قومی خزانے کے خالق اور صاحب طرز شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی تاریخ گوئی کے فن کو بخوبی برتا گیا ہے۔ مولانا حالی نے انسان کو حیوان ناطق یعنی بولنے والا جانور قرار دیا ہے۔ اسی نسبت سے رعایتِ لفظی سے کام لیتے ہوئے شوکت تھانوی سے دریائی جانور کی علامت حفیظ جالندھری اور خود کے لیے برتی ہے۔ بقول شوکت تھانوی:

"بات یہ ہے کہ حفیظ صاحب کہ ہم اور آپ تو اس بحر جہاں میں دریائی جانور ہیں۔ یہ تو ہمارے قدر شناس ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم کو ابھرنا ہے یا ڈوبنا۔ ہم بہر حال حیوان رہیں گے خواہ بھنور میں رہیں یا آشیانے میں۔ حیوانِ مطلق ہوں تو بھی نقشِ بر آب اور حیوانِ ناطق ہوں تو بھی زیادہ سے زیادہ آبِ حیات قسم کے تذکروں میں ذکر باقی رہ جاتا ہے۔ خود حباب آبِ فنا ہو جاتے ہیں گو ہر مراد کے لیے غوطہ لگانے والے سید سکندر نہیں دیکھے۔"(۳۷)

انھوں نے سید امتیاز علی تاج کے نام لکھے گئے مکتوب میں ڈیزل کار کے حوالے سے معلومات پیش کر کے مزاح پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ نو آبادیاتی دور میں ریل گاڑی کا رواج ہندوستان میں عام ہوا۔ ہندوستانیوں نے ریل گاڑی سے متعلق کئی افواہیں گھڑیں اور اسے گوروں کی ہندوستانیوں کے خلاف نئی سازش بھی قرار دیا۔ شوکت تھانوی نے بھی لفظی ہیر پھیر اور طنزیہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے ریل گاڑی کو موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے وہ رعایت لفظی سے یوں کام لیتے ہیں:

"میں اس وقت سفر میں ہوں بلکہ سفر کا قصوروار ہوں۔ اس لیے کہ قصور جارہا ہوں اور ایک ایسی

سواری میں جارہا ہوں جو نہ موٹر ہے نہ ریل۔ نہ بیل گاڑی ہے نہ اونٹ، معلوم ہوتا ہے کہ کسی موٹر اور ریل کی سول میرج نے یہ سواری پیدا کی ہے جس پر میں سفر کر رہا ہوں۔ اس کو ڈیزل کار کہتے ہیں۔" (۳۸)

اسی طرح انھوں نے تشبیہ کا مزاحیہ حربہ برتتے ہوئے مذکورہ بالا مکتوب ہی میں ریل گاڑی کی نئی قسم ڈیزل کار کو حمام سے تشبیہ دی ہے۔ ان کے خیال میں یہ ڈیزل کار درجوں کے بنا انوکھی گاڑی ہے جس سے متعلق وہ مزید یوں گویا ہوتے ہیں:

"یہ ڈیزل کار ریلوے کے محکمہ نے اپنی ترقی پسندی کے اظہار کے طور پر جاری کی ہے کہ اس میں سفر کرنے والے سب ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں۔ نہ کوئی بلند نہ کوئی پست۔ نہ تیسرا درجہ نہ درمیانہ، نہ دوسرا نہ پہلا۔ بس ایک ہی درجہ ہے خواہ اس کو کوئی درجہ سمجھ لیجیے اور اگر اس جھگڑے سے بچنا ہی منظور ہو تو اس کو ایک حمام سمجھ لیجیے جس میں سب کے سب ایک ہی حالت میں نظر آتے ہیں۔" (۳۹)

اسی مکتوب میں شوکت تھانوی نے مزاحیہ لطائف کی مدد سے برصغیر پاک و ہند میں آبادی میں ہونے والے بے ہنگم اضافے کو بھرپور طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جنوبی ایشیاء کا یہ خطہ جسے برصغیر پاک و ہند بھی کہا جاتا ہے، بنیادی طور پر تین ممالک پر مشتمل ہے۔ ان تین ممالک میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش شامل ہیں جن کی کل آبادی لگ بھگ پونے دو ارب ہے۔ آبادی کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے بڑا خطہ ہے۔ جہاں پوری دنیا کے قریباً ایک چوتھائی لوگ آباد ہیں۔ جہاں سائنس دان اور مقتدر طبقہ آبادی کے اس بے ہنگم پھیلاؤ سے پریشان ہے، وہاں شوکت تھانوی جیسے مزاح نگار اور دانش مند افراد بھی اس بنیادی مسئلے سے بخوبی آگاہ ہیں اور اس تناظر میں ہندوستان مردوزن کا طنز کا نشانہ بنائے رکھتے ہیں۔ شوکت تھانوی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"میرے ہم نشینوں میں سے ایک صاحب اپنی بیگم کے برقعہ میں منہ ڈالتے غالباً کوئی سیاسی گتھی سلجھا رہے ہیں اور ان کو شیر خوار بچہ رو رو کر دوسرے مسافروں کا درسِ عبرت دئے رہا ہے کہ "زنہار" اگر تمھیں اولاد کی تمنا ہے تو میرے والدین کی طرح اپنے کو "ماضی تمنائی" بنانے سے بچانا۔ دنیا کی آبادی بڑھانا عیب نہیں مگر اس بہانے سے دنیا کے مصائب میں اضافہ نہ کرنا۔" (۴۰)

آبادی اور ریل گاڑی کی مناسبت سے مابعد نوآبادیاتی نظام انھوں نے پاکستان میں ہونے والی مردم شماری کو بھی خوب طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جس میں کئی فوت شدگان کو بھی زندہ کر کے آبادی میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے مختلف ریلوے قیام گاہوں سے

متعلق اور ان کے ناموں سے متعلق بھی مزاحیہ گفتگو کی ہے اور لفظی ہیر پھیر جیسے مزاحیہ حربے سے بخوبی کام لیا ہے۔ ان میں جیاپگا اور کانا چھانا وغیرہ جیسے الفاظ بھی انہوں نے طنزیہ اسلوب میں برتے ہیں۔

''اسٹیشن آگیا ہے تاج صاحب ملاحظہ فرمائیے کیا تاریخی اسم مبارک پایا ہے اس اسٹیشن نے بھی ''جیاپگا'' معلوم نہیں یہ اسٹیشنوں کے نام کون صاحب رکھا کرتے ہیں اور ان ناموں کی آخر وجہ تسمیہ کیا ہوتی ہے۔ بس صاحب عجیب عجیب نام ہوتے ہیں اور یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ یہ نام کس زبان میں رکھے گئے ہیں؟ مثلاً اسی راستہ میں ایک اسٹیشن کا اسم مبارک ہے ''کاناکاچھا'' مجھ کو اپنی ناسمجھی کا اعتراف ہے کچھ آپ کی سمجھ میں آتی ہے اس کی وجہ تسمیہ۔''(۴۱)

حفیظ جالندھری کے نام لکھے گئے مکتوب میں مصنف نے مختلف محاورہ جات، ضرب الامثال اور مختلف ادبی اصطلاحات و تراکیب کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے اور ان تراکیب میں لفظی ہیر پھیر سے مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مزید برآں انھوں نے حفیظ جالندھری کے نام کی مناسبت سے بھی مزاح کو برتا ہے۔ اس تناظر میں ان کا درج ذیل اقتباس قاری کے لبوں پر شبنم لانے کا باعث بنتا ہے۔

''ان ''اہلِ عشق'' نے آپ کو بھی وہ ہی سمجھا جو اول دن سمجھا تھا، وہی بے تکلفی، وہی گھر کی مرغی کو دال برابر سمجھنے کی کیفیت بلکہ آپ کی ترقیوں پر ایک خندۂ زیرلب، حفیظ صاحب دیکھیے میں نے تبسم زیرلب نہیں کہا ہے۔ خندۂ زیرِلب وہ ہوتا ہے جو ہوتا تو ہے زیرِلب مگر ایک گونج بھی ہوتی ہے اُس کی۔''(۴۲)

سید عابد علی عابد کے نام لکھے گئے مکتوب میں انھوں نے پان خوری اور انسانی شخصیت کے مابین تعلق پیدا کر کے قارئین کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مکتوب میں نصف نے ضلع جگت جیسے کامیاب مزاحیہ حربے کو بھی کامیابی سے برتا ہے۔ پان اور انسانی شخصیت سے متعلق ان کا خیال ہے کہ پان کھانے سے انسانی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے سید عابد علی عابد کے نام لکھے گئے خط میں یوں گویا ہوتے ہیں:

''خیر چھوڑیے اس پان کے ذکر کو میں اگر آپ کی خاطر سگریٹ آشنا نہ ہو سکا تو آپ سے پان ناشناسی کی شکایت بھی جائز نہیں۔ آپ بغیر پان کھائے بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ پان کھا لیتے تو خدا جانے کتنے اچھے معلوم ہوتے؟''(۴۳)

اسی طرح انھوں نے فقرہ بازی اور مزاحیہ جملوں سے بھی مذکورہ مجموعے کو مزین کیا ہے۔ اس تناظر میں پنڈت ہری چند اختر کے نام لکھے گئے مکتوب میں مذہبی طریقے سے بھی طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ انھوں نے ہندو بنئے کی متعصب سوچ پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ ان کے نام خیال میں متعصب ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف تنگ نظری کا مظاہرہ کیا۔ اسی طرح انھوں نے ہندو بنیے کی اس سوچ کے ساتھ ساتھ سگریٹ اور پان کا مزاحیہ انداز میں موازنہ بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ پنڈت ہری چند اختر کے نام لکھے گئے مکتوب میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''سگریٹ کو اگر حقے کا ''تیمم'' سمجھا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر پان کو جو لوگ سگریٹ کی پستی میں لاتے ہیں ان کی اس زیادتی پر افسوس ضرور ہوتا ہے۔''(۴۴)

عابد علی عابد کے نام لکھے گئے مکاتیب میں انھوں نے لطائف کی مدد سے مزاح پیدا کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ انھوں نے ان لطائف کی مدد سے وطنِ عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تعلیمی انحطاط اور تحقیق کے فقدان کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ہماری جامعات میں تحقیقی رجحان خوفناک حد تک کم ہے۔ طلبا و طالبات کے پاس اعلیٰ ڈگریاں تو ہیں مگر اس ڈگری کے مطابق معلومات اور تحقیقی صلاحیتوں کا فقدان ہوتا ہے۔ شوکت تھانوی نے سید عابد علی عابد کے نام لکھے گئے مکتوب میں دیوانِ غالب سے متعلق مزاحیہ لطیفہ بیان کر کے ہمارے علمی زوال پر یوں طنز کیا ہے:

> ''ایک گریجویٹ قسم کے بحر العلوم سے حال ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ادھر اُدھر کی دوچار ادبی باتوں کے بعد اُن محترم نے یہ سوال کر کے آئینۂ حیرت بنادیا کہ ''دیوانِ غالب میں کچھ غزلیں اس کی بھی ہیں کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا دیوان علیحدہ چھاپ دیا جائے۔'' ظاہر ہے کہ اس سوال پر پہلا گمان خوش طبعی کا ہو سکتا ہے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت مزاح نہیں فرمارہے بلکہ واقعی دیوانِ غالب میں کلامِ اسد دیکھنے کے روادار نہیں تو اُن سے پوچھنا پڑا کہ جناب کس یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں تاکہ اپنے بچوں کو اس یونیورسٹی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔''(۴۵)

معروف ناول نویس فضل احمد کریم فضلی کے نام لکھے گئے مکتوب میں شوکت تھانوی نے تمباکو نوشی کے مضر اثرات پر طنزیہ اسلوب میں گفتگو کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان میں مادیت پرستی کا رجحان خوفناک حد تک بڑھتا چلا جاتا ہے اور لوگ مادیت پرستی میں

زندگی کے جمالیاتی پہلو کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے تمباکو اور آبِ حیوان کے مابین تقابل پیدا کر کے قاری کی توجہ اپنی بذلہ سنجی کی جانب مبذول کرائی ہے۔ اس تناظر میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''تمباکو کی تلاش تو آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ آپ حیوان کی تلاش سے کم نہیں۔ عجیب عالم ہے اپنا کہ لوگ پاکستان میں سونے چاندی، لوہے اور کوئلے کی کانیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور ہم تمباکو کے جنون میں سرگرداں ہیں۔''(۴۶)

انھوں نے مذکورہ بالا خط ہی میں معروف ناول نگار فضل کریم فضلی سے مخاطب ہوتے ہوئے رمضان المبارک میں ہونے والی مصروفیت اور اس کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے بذلہ سنجی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے زندگی میں ہونے والی بے ترتیبی کو یوں بیان کیا ہے:

> ''کچھ عجیب رمضان شریف کی سی کیفیت طاری رہتی ہے کہ قلم اُٹھانے کو تو اُٹھالیا مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ قلم اٹھانے کا مقصد کیا تھا؟ پاجامے میں ازار بند ڈالنا تھا، کسی کو خط لکھنا تھا یا کیا۔''(۴۷)

مجید لاہور کے نام لکھے گئے خط میں انھوں نے کمال مہارت سے طنز و ظرافت کے شگوفے چھوڑے ہیں۔ ان کے خیال میں مزاح نگاری ایک کٹھن مرحلہ ہے جس میں قارئین کو ہنسانے کے لیے مزاح نگار کو کئی جتن کرنا پڑتے ہیں۔ سٹیفن لی کاک کے خیال میں ہر کامیاب مزاح کے پیچھے آنسوؤں کا ایک سیلاب ہو سکتا ہے۔ مزاح نگاری سے متعلق شوکت تھانوی نے اپنے خیالات بڑے واضح انداز سے سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ اس تناظر میں وہ مزاح نگاری کے پردے میں پوشیدہ غموں اور کرب کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہمارا ہی دل جانتا ہے کہ ہم اپنے کتنے آنسوؤں کا گلا گھونٹ کر اپنے لبوں پر وہ ایک تبسم پیدا کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے ہنسنے کی تحریک کا کام دیتا ہے۔ ہم اپنے آنسو پی کر دنیا کو ہنساتے ہیں۔ ہم اپنی افسردہ دلی سے انجمن کو افسردہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اشکوں سے دنیا کے لیے مسرت نچوڑتے ہیں۔ اپنے کو چکنا گھڑا ثابت کرتے ہیں، آلام پر وف ثابت کرتے ہیں۔ خود مضحک قسم کے سوانگ رچا کر اپنے اوپر دنیا کو ہنساتے ہیں۔(۴۸)

اسی طرح انھوں نے اسی مکتوب میں لطائف کی مدد سے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے پان خوری کا موازنہ ایک شریر بچے سے کیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے شوکت تھانوی اور مجید لاہور کی مزاح نگاری کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"آپ نے کسی ایسے شریر بچے کو کبھی دیکھا ہے جس کی شرارت پر کان پکڑ لیجیے تو وہ بسورتا ہوا تھوڑی دور تک چلا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد کان کھینچنے والے کو منہ چڑھا کر بھاگتا ہے اور دل میں خوش ہوتا ہے کہ تھوڑا بہت انتقام کو لے ہی لیا۔"(۴۹)

ان کے خیال میں مزاح نگاری اور ہنسنا ہنسانا ایک قسم کی اداکاری ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مزاح نگاری کو دروغ گوئی سے مماثلت دی ہے۔ مزاح نگار کو قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لیے دروغ گوئی سے کام لینا پڑتا ہے۔ انھوں نے مجید لاہور کو ورزشی قسم کا مزاح نگار قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں انھیں "ابوالہول" اور اردو مزاح کا رستم زماں قرار دیا ہے۔ مجید لاہور کا رسالہ "نمکدان" طنز و ظرافت کی دنیا میں نمایاں مقام رکھتا ہے اور اس رسالے کے حوالے سے بھی شوکت تھانوی نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ انھوں نے مجید لاہور کی مزاح نگاری پر تبصرہ بھی مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سے متعلق وہ درج ذیل اقتباس میں یوں اپنے احساسات سپرد قلم کرتے ہیں:

"ان حالات کا مقابلہ کرنے اور ان حالات کی ہنسی اُڑانے کے لیے ہاتھی کا کلیجا اور شیر کا دل چاہیے جو سچی بات یہ ہے کہ اپنے پاس تو ہے نہیں، البتہ ایک آپ ایسے ہیں کہ خود ہاتھی کے پاس آپ کا کلیجہ ہو تو کوئی تعجب نہیں۔ معاف کیجیے گا میں شروع شروع میں آپ کے متعلق غور کیا کرتا تھا کہ اس قسم کا "ابوالہول" انسان مزاح نگار یا کسی قسم کا آرٹسٹ کیسے ہو سکتا ہے وہ عناصر جن سے ایک پوری عمارت بن سکتی تھی آپ کی تخلیق پر صرف کر دیے گئے تو اس کا مطلب یہ کہاں سے ہو گیا کہ آپ بجائے رستم زماں ہونے کے شاعر اور انشا پرداز بننے کی زبردستی بھی کر سکتے ہیں مگر رفتہ رفتہ یہ نکتہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ اور کچھ نہ سہی مگر مزاح نگاری کرنے کے لیے تو کم سے کم اتنا ہی ڈیل ڈول ہونا چاہیے کہ زمانے کی تلخیوں کے احساس کو اتنے بڑے جسم سے گزر کر دل تک پہنچنے کے لیے بھی ایک موت درکار ہو۔"(۵۰)

انھوں نے مزاح نگاری کے خوفناک انجام پر بھی طنزیہ جملے پیش کیے ہیں۔ ان کے خیال میں مزاح نگاری خالصتاً گھاٹے کا سودا ہے اور مزاح نگاری کرتے ہوئے فنکار انسانیت کے درجے سے بھی گر جاتا ہے۔ انھوں نے مزاح نگاری اور انسانی صحت کے مابین بھی دلچسپ تقابل پیش کیا ہے۔ اس تناظر میں وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

"کاش مزاح نگاری شروع کرنے سے پہلے ہم نے بھی دور اندیشی سے کام لیا ہوتا اپنی صحت اور غذا

کا اتنا ہی خیال رکھا ہوتا جتنا آپ نے رکھا ہے کہ یہ عمر ہونے کو آئی مگر "گلیکسو" کا استعمال جاری ہے۔ مدعا یہ ہے کہ آپ تو بے شک زور آزمائی کرتے رہیں گے اور جب اللہ نے زور دیا ہے تو کیوں نہ زور آزمائی کریں۔"(۵۱)

شوکت تھانوی نے مذکورہ مجموعے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "غبارِ خاطر" کی تحریف نگاری کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں مولانا ابوالکلام آزاد اور اپنی مزاح نگار کے مابین تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ اپنی ذات پر طنز کے نشتر چلانا کسی بھی مصنف اور قلم کار کے لیے ایک مشکل اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ مگر شوکت تھانوی نے یہ کٹھن مرحلہ بخوبی انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنی علمی قابلیت کو مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں ہیچ اور کم گردانا ہے۔ اور اس بات کا بھی عاجزی سے انکار کیا ہے کہ وہ تحریف نگاری کے مفہوم سے قطعی طور پر ناآشنا ہیں۔ انھوں نے "بارِ خاطر" کو پیروڈی کے بجائے منہ چڑانے کی ترکیب سے واضح کیا ہے۔ اس سے متعلق وہ یوں رقم طراز ہیں:

"آپ کے ان مکاتیب سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غالباً غبارِ خاطر کو صرف اتنا ہی سمجھا ہے کہ مولانا نے ان تمام اشعار کے استعمال کے لیے یہ خطوط لکھے ہیں جو ان کے حافظہ میں محفوظ تھے یا زیادہ سے زیادہ آپ کے پلے مولانا کا چائے سے شغف پڑ گیا ہے جس کو آپ نے اپنے پان کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اگر اسی کا نام پیروڈی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خیر سے آپ پیروڈی کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں۔ اس کو پیروڈی سے زیادہ منہ چڑانا کہنا چاہیے۔"(۵۲)

انھوں نے اس کتاب کے عنوان پر بھی طنز کے تیر چلائے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ کتاب "غبارِ خاطر" کی تحریف نگاری نہیں ہے۔ بلکہ صرف عنوان کی مناسبت سے اسے "غبارِ خاطر" کی تحریف نگاری تصور کیا جارہا ہے۔ ورنہ اس کتاب کا عنوان "مکاتیبِ شوکت" ہونا چاہیے۔ بقول شوکت تھانوی:

"بارِ خاطر کے مصنف کے لیے اگر بارِ خاطر نہ ہو تو یہ دوستانہ مشورہ پیش کرتا ہوں کہ ان مکاتیب پر سے غبارِ خاطر کی پیروڈی کا لیبل اتار لیجیے۔ اس کا نام بارِ خاطر بھی نہ رکھیے سیدھا سادا نام "مکاتیبِ شوکت" رکھ لیجیے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ ہے یہ جہاں تک پیروڈی کا تعلق ہے پیروڈی تو بس یہیں ختم ہوگئی کہ آپ نے "غبارِ خاطر" کی جگہ اپنے اس مجموعہ کا نام "بارِ خاطر" رکھ دیا مگر اس کے بعد آپ کو چاہیے تھا کہ قارئین کے لیے بارِ خاطر بنتے آپ تو سچ مچ بارِ خاطر ہی بن

گئے۔''(۵۳)

مصنف نے اس کتاب میں طنز و مزاح کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے فقرہ بازی، بذلہ سنجی، طنزیہ لہجی، لطائف اور موازنہ و تضاد کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں تحریف نگاری اور رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے بھی مصنف نے قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیری ہے۔ مصنف چونکہ اردو ادب کے نامور مزاح نگار ہیں، اسی لیے ان کی تحریروں میں جابجا طنز و ظرافت کی مثالیں دکھائی دیتی ہیں جو اس کتاب کو ایک مزاحیہ ادب بنانے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ انھوں نے آبادی میں بے ہنگم اضافے اور اس کے منفی اثرات کو بھی کامیابی سے بے نقاب کیا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف ادبی اور معاشرتی بے ڈھنگے پن اور سماجی ناہمواریوں کو طنزیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱. شوکت تھانوی: ''بارِ خاطر'' بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۰ء، ص ۱۷
۲. ایضاً، ص ۲۰
۳. ایضاً، ص ۲۷
۴. ایضاً، ص ۱۲
۵. مجید امجد: ''کلیاتِ مجید امجد'' مرتب: خواجہ محمد زکریا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۸۸
۶. شوکت تھانوی: ''بارِ خاطر'' ص ۱۸
۷. ایضاً، ص ۱۱
۸. ایضاً، ص ۱۶
۹. ایضاً، ص ۱۵
۱۰. ایضاً، ص ۴۴
۱۱. ایضاً
۱۲. ایضاً، ص ۶۷ تا ۶۸
۱۳. ایضاً، ص ۶۹

۱۴. ایضاً، ص ۲۷ تا ۳۷
۱۵. ایضاً، ص ۱۶۹ تا ۱۷۰
۱۶. ایضاً، ص ۲۴۳
۱۷. ایضاً، ص ۲۴۶
۱۸. ایضاً، ص ۲۳۹
۱۹. ایضاً، ص ۲۲۳
۲۰. ایضاً، ص ۲۰۸ تا ۲۰۹
۲۱. ایضاً، ص ۱۹۵
۲۲. ایضاً، ص ۱۹۰
۲۳. ایضاً، ص ۱۵۲
۲۴. ایضاً، ص ۱۳۴
۲۵. ایضاً، ص ۱۱۳
۲۶. ایضاً، ص ۸۵
۲۷. ایضاً، ص ۲۰
۲۸. ایضاً، ص ۲۲
۲۹. ایضاً، ص ۳۵
۳۰. ایضاً
۳۱. ایضاً، ص ۴۳
۳۲. ایضاً
۳۳. ایضاً، ص ۴۵
۳۴. ڈاکٹر وزیر آغا: ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' مکتبہ عالیہ، لاہور، اشاعت ششم، ۱۹۹۳ء، ص ۴۲ تا ۴۳
۳۵. شوکت تھانوی: ''بارِ خاطر'' ص ۴۴

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۱۰ شمارہ ۰۲، ۲۰۲۳

۳۶. ایضاً، ص ۴۷ تا ۴۸

۳۷. ایضاً، ص ۳۹

۳۸. ایضاً، ص ۲۴

۳۹. ایضاً، ص ۲۴ تا ۲۵

۴۰. ایضاً، ص ۲۵

۴۱. ایضاً، ص ۲۷ تا ۲۸

۴۲. ایضاً، ص ۳۴

۴۳. ایضاً، ص ۵۰

۴۴. ایضاً، ص ۲۴۲ تا ۲۴۳

۴۵. ایضاً، ص ۵۲

۴۶. ایضاً، ص ۷۸

۴۷. ایضاً، ص ۷۹

۴۸. ایضاً، ص ۱۳۳

۴۹. ایضاً

۵۰. ایضاً، ص ۱۳۴ تا ۱۳۵

۵۱. ایضاً، ص ۱۳۵

۵۲. ایضاً، ص ۲۷۳

۵۳. ایضاً، ص ۲۷۴ تا ۲۷۵